© rasailojaraid.com

سرسید، ایک مورّخ کی حیثیت سے

از سید محمود احمد برکاتی، کراچی

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء) ۱۹ ویں صدی کی ایک اہم شخصیت تھے۔ وہ ایک سیاسی و سماجی مدبر و قائد بھی تھے اور ادیب و مصنف بھی، اور ان دونوں جہتوں سے مسلسل موضوعِ بحث و گفتگو رہے ہیں۔

ان کی بیش تر تحریروں کے موضوعات دینی یا سیاسی یا تاریخی ہیں۔ ان کے رسائل و کتب کی زیادہ تعداد تاریخ و سیرت سے متعلق ہے، ان کی سب سے پہلی اور سب سے آخری کتابیں بھی تاریخ و سیرت ہی کے موضوع پر ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ ان کا رجحان تاریخ کی طرف زیادہ تھا۔

ان کے تاریخی رسائل و کتب کی ترتیب و تفصیل یہ ہے:

۱۔ جامِ جم (۱۸۳۹ء)

۲۔ جلاء القلوب (۱۸۴۳ء)

۳۔ آثار الصنادید (۱۸۴۷ء)

مضمون نگار: کراچی (پاکستان) کے مشہور طبیب اور صاحبِ قلم۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ سلسلۃ الملوک (۱۸۵۲ء)

۵۔ تاریخ بجنور (۱۸۵۶ء)

۶۔ آئین اکبری (تدوین) (۱۸۵۶ء)

۷۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور (۱۸۵۹ء)

۸۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (۱۸۶۱ء)

۹۔ تاریخ فیروز شاہی (تدوین) (۱۸۶۲ء)

۱۰۔ تزک جہانگیری (تدوین) (۱۸۶۳-۶۴ء)

۱۱۔ الخطبات الاحمدیہ (۱۸۷۲ء)

۱۲۔ قدیم نظام دیہی ہندوستان (۱۸۷۸ء)

۱۳۔ سیرت فریدیہ (۱۸۹۶ء)

ذیل میں ان میں سے چند کا جائزہ اور مطالعہ کیا گیا ہے کہ وہ تاریخ نویسی اور قدیم کتب تاریخ کی تصحیح و تدوین میں کس حد تک کامیاب رہے اور اس طرح ان کا مورخانہ مقام کیا متعین ہوتا ہے؟

آثار الصنادید

سرسید کی تاریخی تصانیف میں اس کتاب کو خصوصیت حاصل ہے۔ اس کتاب کے ایک حصے (باب چہارم) میں ایک سو بیس خاصان حضرت دہلی کے سوانح ہیں اور ایک حصے میں دہلی اور اس کے اطراف کی تقریباً دو سو[۲۰] عمارات کا بیان ہے، یہ کتاب پہلی بار ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی، دوسری بار مصنف ہی نے اسے باب چہارم[ع] حذف کرکے ۱۸۵۴ء میں شائع کیا

ع۔ باب چہارم تذکرۂ اہل دہلی کے نام سے قاضی احمد میاں اختر نے ۱۹۵۵ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع کیا تھا، مقالات سرسید میں بھی صرف یہی باب شائع کیا گیا ہے، عمارات دہلی کا حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا، تیسری بار ۱۸۷۶ء نول کشور پریس سے اور چوتھی بار ۱۹۰۴ء میں نامی پریس کان پور سے شائع ہوئی، پھر ۱۹۶۵ء میں (مقالات سرسید کے ۱۶ ویں حصے کے طور پر) لاہور سے ۱۹۶۵ء میں دہلی سے اور ۱۹۶۶ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ کراچی کا ایڈیشن نامور محقق ڈاکٹر سید معین الحق نے مرتب کیا ہے اور اپنے محققانہ حواشی سے داد تحقیق دی ہے۔

آثار الصنادید کی تالیف میں سرسید نے محنت شاقہ برداشت کی، زر کثیر صرف کیا اور عمارات کے کتبے پڑھنے میں پرخطر ذرائع کے استعمال تک میں باک نہیں کیا۔ بحیثیت مجموعی دہلی کے آثار قدیمہ پر یہ ایک قابل قدر کتاب ہے۔

آثار میں سرسید نے بعض عمارات کی بناء و تعمیر کے سلسلے میں اپنی لاعلمی و نارسائی کا اظہار کیا ہے اور بعض عمارات کو اصل بانی کے بجائے دوسرے سے منسوب کر دیا ہے اور بعض دوسرے تسامح ان سے سرزد ہوئے ہیں، ذیل میں ان میں سے چند کی نشان دہی مقصود ہے۔

(۱) عمارات ہزار ستون، سلطان محمد تغلق (ف ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) نے اپنے اختیار کردہ لقب عادل کی مناسبت سے عادل آباد کے نام سے جو شہر بسایا تھا اس میں محلات شاہی کو ہزار ستون کہا جاتا ہے، اس عمارت کے متعلق سرسید کا بیان ہے کہ[۱]

"ہزار ستون سنگ خارا کے اس میں لگے ہوئے تھے"

مگر ابن بطوطہ جو محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی آیا تھا اس کے ستونوں کو لکڑی کے بتاتا ہے[۲]

"اس کی بنا لکڑی کے ستونوں پر زمین سے بلندی پر رکھی"

---

[۱] ص۵۵ آثار الصنادید مدونہ ڈاکٹر سید معین الحق، کراچی ۱۹۶۶ء

[۲] ص۶۲ سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم، مدونہ خان صاحب محمد حسین ایم اے، لاہور، ۱۸۹۸ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) ست پُلہ، سرسید نے اس کو سلطان فیروز شاہ کی تعمیر لکھا ہے[1] مگر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار[2] میں دو مقامات پر اسے محمد بن تغلق کی تعمیر لکھا ہے، خان شاکی بھی یہی تحقیق ہے[3]۔

(۳) نیلا بُرج، سرسید نے اس کے بانی اور عہد بنا سے لاعلمی ظاہر کی ہے[4] یہ فہیم خاں کا مقبرہ ہے جو خان خاناں عبدالرحیم خاں کے عزیز اور ندیم تھے اور خان خاناں نے ۱۶۲۴ء میں بنوایا تھا[5]۔

(۴) مسجد قلعہ، سرسید نے اس کی تعمیر ہمایوں سے منسوب کی ہے حال آں کہ یہ شیر شاہ نے ۱۶۴۱ میں بنوائی تھی[6]۔

(۵) کابلی دروازہ، سرسید نے اس کے عہد بنا سے لاعلمی ظاہر کی ہے، ڈاکٹر سید معین الحق لکھتے ہیں کہ[7]

"اس کی تعمیر غالباً شیر شاہ کے ابتدائی دور یعنی ۱۵۴۰ء میں ہوئی"

(۶) مسجد قوت الاسلام، سرسید نے اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ رائے پتھورا کے بنا کردہ مندر کو توڑ کر سلطان معزالدین محمد بن سام نے اس بت خانے کی جگہ یہ مسجد تعمیر کروائی تھی[8]۔

۱۔ آثار، طبع کراچی ص ۲۲

۲۔ ص ۱۲۷، ص ۲۱۵ اخبار الاخیار مطبع ہاشمی میرٹھ۔

۳۔ ص ۲۸۷ دہلی پاسٹ اینڈ پریزنٹ، لندن ۱۹۰۲ء، ڈاکٹر سید معین الحق

۴۔ آثار ص ۳۲ ۔۔۔ ۵۔ ڈاکٹر سید معین الحق ص ۳۲

۶۔ ڈاکٹر سید معین الحق ۔۔۔ ۷۔ ڈاکٹر سید معین الحق ص ۶۰

۸۔ آثار ص ۶۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر ڈاکٹر سید معین الحق نے اس کی تردید کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"دورِ جدید کے اکثر مورخوں نے قرونِ وسطی کی تصانیف
کے بیانات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا اور ان کے الفاظ کے
ظاہری معنی لئے ہیں جس سے بہت سے گم راہ نتائج اخذ
کرنے میں ان کو سہولت ہوتی ہے۔"

ان کا بیان ہے کہ اس مسجد کی تعمیر قطب الدین ایبک (۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) نے کروائی
اور شمس الدین ایلتمش (۶۳۳ھ/ ۱۲۳۶ء) نے اس کی توسیع کی اور

"اس موقع پر کسی مندر یا شکستہ عمارت کا ملبہ استعمال
کرنے کی شہادت نہیں ملتی" (ص ۶۵)۔

(۷) حوض خاص، سر سید نے اس کا بانی فیروز شاہ کو لکھا ہے (ص ۱۹) مگر ڈاکٹر
معین الحق نے ظفر نامۂ تیموری کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ علاء الدین خلجی (ف ۱۳۱۹ء)
نے بنوایا تھا اور اسی لئے ابتدا میں یہ حوض علائی کہلاتا تھا، امیر تیمور نے دہلی پر
حملے کے وقت اسی حوض کے کنارے اپنا کیمپ قائم کیا تھا۔ فیروز شاہ نے اس کی مرمت
کروائی تھی (ص ۱۰۹)

سفرنامۂ ابن بطوطہ کے مترجم و محشی مولوی محمد حسین نے سر سید کا تعاقب کیا
ہے لہ

یہ غلطی سید صاحب کو کہنے سے واقع ہوئی ہے، لیکن
فتوحات فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ نے
فقط اس حوض کو صاف کر کے اس کی مرمت کرائی تھی، یہ

لہ سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم ص ۴۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوض دراصل سلطان علاء الدین خلجی کا بنایا ہوا ہے۔"

(۸) موٹھ کی مسجد کے بانی کے متعلق سر سید نے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے، ڈاکٹر سید معین الحق نے خلاصۃ التواریخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ مسجد سکندر لودھی کے درباری (اور طبیب) بہوہ خاں بن خواص خاں نے بنوائی تھی۔ (ص ۱۱۱)

(۹) فیض نہر، اس کے متعلق سر سید نے لکھا ہے کہ یہ نہر فیروز شاہ بن سالار رجب نے بنوائی تھی (ص ۱۵۷) مگر درحقیقت یہ فیروز شاہ خلجی نے ۱۲۹۱ء میں تیار کروائی تھی (ڈاکٹر سید معین الحق)

تزک جہانگیری[لہ]

اس کتاب میں جہانگیر نے ۱۰۱۴ھ سے ۱۰۳۱ھ تک کے حالات و واقعات خود اپنے قلم سے لکھے اور بعد کے سالوں کے اپنے درباری معتمد خاں سے لکھوائے ہیں۔ سر سید نے یہ کتاب ۱۸۶۴ء میں مدون کر کے شائع کی تھی، سرورق پر اردو میں لکھا ہے:

"بہ تصحیح نیاز مند درگاہ سید احمد بقالب طبع در آمد"

انگریزی میں ہے:

"ایڈیٹڈ بائی سید احمد، پرنٹڈ ہز پرائیویٹ پریس
1884 اے ڈی / H1281"

ابتدا میں ۲۱ صفحات کا مقدمہ ہے، اس کے بعد پھر ایک سرورق اس پر انگریزی میں ہے:

لہ معلوم نہیں کیوں، ڈاکٹر محمود حسین خاں اور ڈاکٹر سید معین الحق جیسے فضلا نے سر سید کی تاریخ نویسی پر اپنے مقالات میں تزک جہانگیری کا مطلق ذکر نہیں کیا، فہرست تصانیف تک میں اس کتاب کا نام نہیں دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ایڈیٹیڈ بائی سید احمد خاں غازی پور، پرنٹڈ ایٹ سرپرائیویٹ
پریس 1863 اے ڈی / HI 280"

تصحیح و تدوین، کسی کتاب کے متعدد مخطوطات کو سامنے رکھ کر ایک صحیح نسخے کی ترتیب کا نام ہے متن کے بیانات کے صواب وخطا کی ذمے داری مدون پر نہیں ہوتی اور مدون کا فرض سمجھا جاتا ہے کہ چاہے مصنف و متن کے بیانات اس کے عقائد سے متصادم ہی کیوں نہ ہوں، ان کو جوں کا توں، من وعن، کسی حرف کے حک و اضافے حتیٰ کہ اعراب کی تصحیح کے بغیر نقل کر دے۔ مدون کو یہ حق اور اختیار ضرور حاصل ہوتا ہے کہ وہ پاورقی میں مصنف کے بیان کی تصحیح و تغلیط کر دے، لیکن یہ بات تصحیح و تدوین کے اصول و روایات کے قطعاً خلاف ہے کہ وہ مصنف کی کسی عبارت کو گم راہ کن، خلاف عقائد یا خلاف عقل یا زبان وبیان کے لحاظ سے غلط قرار دے کر حذف یا تبدیل کر دے۔

سر سید کی تزک جہانگیری میں دو ایسے مقامات علم ونظر میں آئے ہیں جہاں انھوں نے مصنف کی عبارت کو کتاب سے حذف اور خارج کر دیا ہے۔

(۱) ابوالفضل کے قتل کا جہاں ذکر ہے وہاں جہانگیر نے ابوالفضل پر جو فرد جرم لگائی ہے اس میں یہ جملہ بھی تھا:

"در پیرانہ سالی پدرم را از راہ مستقیم باز داشت"

مگر سر سید کی مدونہ تزک جہانگیری میں یہ جملہ نہیں ہے، مولانا نسیم احمد فریدی لکھتے ہیں کہ "میں نے ایک مخطوطہ تزک (مدرسہ اشاعت العلوم بریلی) میں یہ عبارت دیکھی تھی۔" [1]

جہانگیر کا یہ جملہ، فرد جرم کی نوعیت ایک دوسری شکل میں پیش کرتا ہے اور یہ تاثر

---

[1] الفرقان (افادات گیلانی نمبر، جولائی ۱۹۵۷ء) لکھنؤ ص ۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا ہے کہ ابوالفضل سے جہانگیر کو عداوت صرف ذاتی بنیادوں پر نہیں تھی بلکہ وہ اس کے افکار و آرا کو راہ مستقیم سے منحرف تصور کرتا اور اسے اپنے والد کے لئے گم راہ کن تصور کرتا تھا اور یہ جملہ خارج ہو جانے کے بعد، ابوالفضل کے قتل کا محرک جہانگیر کی اس سے ذاتی رنجش محسوس ہوتی ہے۔

(۲) جہانگیر کو ایک بار ۱۰۱۶ھ میں سات بنگالی بازی گروں اور شعبدہ بازوں نے اپنے ہنر دکھائے تھے اور جہانگیر اور اس کے درباریوں نے دو رات دن مسلسل بیٹھ کر یہ تماشا دیکھا تھا اور اپنی تزک میں حیرت کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا تھا

مگر سرسید نے تزک سے یہ مقام حذف کر دیا،

ابن بطوطہ نے چین میں ایسے ہی حیرت ناک کرتب دیکھے تھے اور اپنے سفر نامے میں ان کا ذکر کیا تھا، مولوی محمد حسین نے سفر نامے کے ترجمے کے دوران اپنے حواشی میں تائید کے طور پر جہانگیر کا یہ بیان نقل کرنا چاہا جو انھوں نے تزک جہانگیری میں دیکھا تھا مگر ان کو اس وقت تزک کا وہ ایڈیشن دست یاب ہوا جو سرسید نے شائع کیا تھا، اور اس میں یہ واقعہ انھیں نہیں ملا، اس لئے انھوں نے طباطبائی کی سیر المتاخرین (جلد اول صفحہ ۲۴۳) سے دربار جہانگیر کا یہ واقعہ نقل کیا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

مجھے تزک جہانگیری کا جو نسخہ ملا وہ تو اتفاقاً علی گڑھ کا چھپا ہوا تھا اس لئے یہ عبارت میں نے سیر المتاخرین سے ترجمہ کی ہے تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڑھ کے نسخے میں یہ مقام سید احمد نے نکال ڈالا ہے۔

اس کے بعد مولوی محمد حسین نے سرسید کے اس فعل کے متعلق اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے

کسی غیر کی کتاب میں یہ تصرف ہر طرح سے مذموم ہے، ایڈیٹر یا محشی یا نقل کرنے والے فقط اس قدر کر سکتے ہیں جیسا کہ سیر المتاخرین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مصنف نے یہ تماشے نقل کر کے لکھ دیا ہے کہ فقیر از کتابے کہ انتساخ نمودہ چنیں نوشتہ اند اگرچہ معقول نیست والعہدۃ علی الراوی۔"

پھر اس کے بعد توجیہ کرتے ہیں

"غالباً سید صاحب مرحوم کو اس بے جا تصرف پر اس بات نے آمادہ کیا ہوگا کہ بازی گروں کے ایسے تماشے دکھانا ان (سرسید) کی کرامات اور معجزات کے انکار کو ضعف پہنچاتا ہے کیوں کہ تماشے کا راوی خود جہانگیر بادشاہ تھا جس کی عادت مبالغہ کرنے کی نہیں ہے اور اس کی قوت مشاہدہ بھی مسلّم تھی تماشے کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا تبلاتا تھا" ص ۲۲۲

ہماری رائے میں مولوی محمد حسین نے توجیہ صحیح کی ہے اور سرسید کی اس کمزوری کی صحیح نشان دہی کی ہے جس نے ان کو اس بے جا تصرف پر آمادہ کیا۔

آخر میں سرسید کے ایک حاشیے کا ذکر بھی دلچسپی کا موجب ہوگا، جو انھوں نے تزک کی ایک عبارت پر لکھا ہے۔

جہانگیر نے تزک میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے چار مرقعے پیش کیے جو پستے کے چھلکے کے برابر ہاتھی دانت کے تھے ان میں سے چوتھے مرقعے میں ایک درخت کے نیچے حضرت عیسیٰؑ کو بیٹھا دکھایا تھا (تزک ص ۹۷) اس پر سرسید نے حاشیہ لکھا کہ

غالباً ایں کارنامہ از کارنامہائے کاری گران فرنگ بودہ و بدستش افتادہ آں را از نام کارنامۂ خود گزرانید

غالباً یہ کسی یوروپین صناع کا کارنامہ تھا جو اس شخص کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے جہانگیر کو اپنے نام سے پیش کر دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دلیل یہ دی ہے کہ ایک مسلمان کی حضرت عیسیٰؑ کی تصویر بنانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔"

اس پر مولانا شبلی نے تعاقب کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"سید صاحب کو اس کا یقین نہیں آسکتا کہ کوئی ہندوستانی شخص بھی ایسا کمال دکھا سکتا ہے، اس لئے فرماتے ہیں کہ کسی یوریپین نے بنائی ہوگی اور اس پر قرینہ یہ قائم کرتے ہیں کہ چوتھے مرقع میں حضرت عیسیٰؑ کی تصویر ہے خوش اعتقادی کی یہ اخیر حد ہے[۱]"

سلسلۃ الملوک

سرسید نے ۱۸۵۲ء میں دہلی کے پانچ ہزار سالہ فرماں رواؤں کا ایک جدول (چارٹ) سلسلۃ الملوک کے نام سے شائع کیا تھا اور اس کو آثارالصنادید کی اشاعت ثانیہ کے آغاز میں شامل کر دیا تھا جو ۱۸۵۲ء میں طبع ہوگئی تھی مگر ۱۸۵۴ء میں شائع ہوسکی۔

اس جدول میں دہلی کے دوسو دو (۲۰۲) راجاؤں اور بادشاہوں کے نام اور دوسری ضروری تفاصیل ہیں، آغاز سے ۱۸۵۲ء تک کے ہر فرماں روا کے لئے ایک خانہ مخصوص کیا گیا ہے، جب اس جدول کے آخری حصے پر نظر ڈالتے ہیں اور ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱ اور ۲۰۲ نمبر کے خانوں کو پڑھتے ہیں تو ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ دہلی کے آخری شاہوں کے خانے یوں تبدیل ہونا چاہیئے تھے۔

شاہ عالم ثانی جلوس ۱۷۵۹ء وفات ۱۸۰۶ء

اکبر شاہ ثانی جلوس ۱۸۰۶ء وفات ۱۸۳۷ء

بہادر شاہ ثانی جلوس ۱۸۳۷ء

مگر ان کے بجائے یہاں شاہان انگلستان "خانہ نشین" نظر آتے ہیں۔

---

[۱] مقالات شبلی حصہ اول صفحہ ۱۷۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ جارج سوم "فتح دہلی" ۱۸۰۳ء انتقال ۱۸۲۰ء
شاہ جارج چہارم جلوس ۱۸۲۰ء انتقال ۱۸۳۰ء
شاہ ولیم چہارم جلوس ۱۸۳۰ء انتقال ۱۸۳۷ء
ملکۂ وکٹوریہ جلوس ۱۸۳۷ء

پہلے تو یہ سوچتے ہیں کہ انہی سرسید نے اس سے ۱۳ سال پہلے ۱۸۳۹ء میں اسی قسم کا ایک جدول (جام جم) شائع کیا تھا جس میں دہلی کے صرف مسلم فرماں رواؤں کے نام تھے (امیر تیمور سے بہادر شاہ ثانی تک) اس وقت بھی تو لارڈ لیک دہلی کو "فتح" کر چکا تھا مگر اس میں شاہ عالم ثانی بھی تھے، اکبر شاہ ثانی بھی اور بہادر شاہ ثانی بھی پھر آخر ۱۳ سال میں حالات میں ایسا کون سا انقلاب آگیا کہ یہ حضرات بادشاہ نہیں رہے اور شاہان انگلستان فرماں روا ہو گئے؟

پھر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ جب اکبر شاہ ثانی دہلی کے فرماں روا نہیں ہوئے تھے تو سرسید کے نانا کس کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے اور انھیں نواب دبیر الدولہ، امین الملک بہادر مصلح جنگ وغیرہ خطابات کس نے اور کس حیثیت سے دیئے اور ان دبیر الدولہ نے وہ سکے کس کے نام سے ڈھالے تھے جو بقول آپ کے غدر تک رائج رہے۔ جب اکبر شاہ ثانی فرماں روا نہیں رہے تھے تو ان کے نام کے سکے کیوں مروج تھے؟ لہ

لہ واضح رہے کہ سرسید نے اپنے وصال سے صرف ۲ سال پہلے ۱۸۹۶ء میں اپنے نانا خواجہ فرید الدین کی سوانح سیرت فریدیہ کے نام سے شائع کی تھی اس کے سرورق پر خواجہ کے لئے یہ پورے خطابات تحریر کئے تھے اور اکبر شاہ ثانی کے وزیر اعظم بنائے جانے کے واقعے کو ان کی زندگی کے سب سے اہم اور نمایاں واقعے کے طور پر لکھا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ شاہ کے سامنے دربار میں ہر درباری کو کھڑا رہنا پڑتا تھا مگر شاہ نے خواجہ کو ایک جریب (چھڑی) عطا کی تھی تاکہ اس کے سہارے کھڑے رہیں۔ اختر لونی کو بھی چھڑی عطا ہوئی تھی یہ ایک بڑا اعزاز تھا جو شاہوں کی جانب سے رعایا کے کسی فرد کو عطا ہوتا تھا۔ سرسید نے اس پر افتخار کا اظہار کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسید کے نانا کے خاص دوست اختر لونی (اکٹر لونی) کو اختر الانام فخر الانام وفادار خاں بہادر ظفر جنگ کے خطابات کس نے دیئے تھے؟ اور یہ اختر لونی کے عہدے ریزیڈنٹ کا کیا مطلب تھا؟ اور یہ ریزیڈنٹ کس کی طرف سے اور کس کے دربار میں تھے؟ اور دربار عام کے موقعوں پر ان کے سامنے کھڑے کیوں ہوتے تھے؟ بیٹھ کیوں نہیں جاتے تھے اور نذریں کیوں پیش کرتے تھے۔؟

خود سرسید کو جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب بہادر شاہ نے کس حیثیت سے دیا تھا؟ اور اس خطاب کو وہ ۱۸۵۷ء میں ہی نہیں، ۱۸۵۷ء میں ہی نہیں ۱۸۹۶ء تک کیوں بڑے فخر اور اہتمام سے استعمال کرتے رہے۔؟

بہادر شاہ ثانی جب فرماں روا نہیں رہے تھے بلکہ تخت نشین ہی نہیں ہوئے تھے تو ان کے نام کا سکہ کیوں رائج ہوا تھا جس کا شعر آپ نے جام جم میں درج کیا ہے؟

ان سوالات کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ صورت حال بالکل مختلف تھی۔

اصل میں اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ ۱۸۰۳ء میں دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا مگر برعظیم کے باحمیت باشندے اس کو سقوط دہلی کہتے ہیں "فتح دہلی" نہیں، بعض مواقع پر بعض حقائق سے صرف نظر ہی معیار شرافت اور تقاضائے حمیت ہوتا ہے تو قومی وملی نقطۂ نظر سے یہ سقوط دہلی تھا، دہلی پر انگریزوں کا تسلط تھا، یہ اہل وطن کے لئے کوئی گوارا اور قبول خاطر خبر نہیں تھی، ایک ناگوار حقیقت اور بار گوش خبر تھی، اس لئے ساکنان حضرت دہلی، خواہ مخواہ حکم کمپنی بہادر کا مانتے تھے مگر مرکز عقیدت لال قلعہ تھا، تخت طاؤس تھا، "بادشاہ سلامت" تھا۔

جہاں تک قانون کا تعلق ہے اس کی رو سے بھی حکومت لال قلعے کے مکینوں ہی کی تھی چاہے اس میں انگریزوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی مصلحت ہی کیوں نہ ہو مگر وہ بھی قانوناً بادشاہ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ثانی ہی کو کہتے تھے، سکہ انہی کے نام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ڈھالا جاتا اور چلتا تھا، ریزیڈنٹ ان کے دربار میں بیٹھ نہیں سکتا تھا، کھڑا رہتا تھا اور بادشاہ تخت طاؤس پر بیٹھتا تھا۔

مختصر یہ کہ ۱۸۵۷ء میں مغل فرماں رواؤں کی جگہ لندن کے شاہوں کو دہلی کا بادشاہ ظاہر کرنا، نہ اظہار حقیقت تھا نہ اہل وطن کے جذبات کی ترجمانی تھی، نہ اس کی بظاہر کوئی ضرورت لاحق ہوئی تھی، نہ ایسا کرنے سے انگریز کے ناخوش ہونے کا اندیشہ تھا۔

"سن ستاون" کے انقلاب سے ۵/۶ سال سے پہلے شاہان دہلی کو اس طرح "معزول" کر کے شاہان انگلستان کو دہلی پر مسلط کر دینا سرسید کا کوئی اضطراری اقدام نہیں تھا جو بے ارادہ اٹھ گیا ہو یا جس پر انھیں ندامت ہو، یہ ان کا سوچا سمجھا اقدام تھا جس پر انھیں ندامت نہیں فخر تھا وہ اس کا اخفا نہیں چاہتے تھے، اعلان کرتے تھے فرماتے ہیں:

"۱۸۵۴ء میں جب میں نے ایک تاریخ دہلی کی پرانی اور اگلی عمارتوں کی لکھی تو سلسلہ سلطنت مغلیہ ۱۸۰۳ء سے یعنی جب سے لارڈ لیک، سپہ سالار سلطنت انگلشیہ نے دہلی کو فتح کیا، منقطع کیا اور ہندستان کی سلطنت سلسلہ شاہان انگلستان کا قائم کیا، اس سے یقین ہو سکتا ہے کہ اس ہنگامے (سن ستاون) سے پہلے میری نیت یہی تھی کہ تمام اہل ہندوستان جان لیں کہ اب سلطنت خاندان مغلیہ کی ختم ہو گئی اور ہندوستان کی بادشاہت شاہان انگلستان کی ہے اس لیے تمام "رعایا" کو اپنے بادشاہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کی خیر خواہی اور اس سے محبت پیدا کرنی چاہیے"[1]

---

[1] لائل محمڈنز آف انڈیا، مطبوعہ مفصلائٹ پریس، آگرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسید نے اب ان افکار و نظریات کی بنا پر خود کو ان عام اہل وطن سے کاٹ لیا تھا، جو ۵/۶ سال بعد ۱۸۵۷ء میں انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، وہ انگریز کے وفاداروں میں شامل ہو گئے تھے اور ان کی حسرتیں، دعائیں اور امانتیں کمپنی کے لئے تھیں اور ہم سیرت فریدیہ کے مقدمے میں تفصیل سے اس پر اظہار خیال کر چکے ہیں۔ اس وقت اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ ایسا کر کے انھوں نے تاریخ نویس کی حیثیت سے صرف نظر کیا اور اپنے سیاسی عزائم اور عقائد کا بے موقع ابلاغ کیا ہے، حقیقت پسندی اور دیانت داری کے بجائے اپنی خواہشوں کو انھوں نے حقیقت فرض کر لیا اور دوسروں سے اس کو منوانا چاہا تھا۔

سیرت فریدیہ

سرسید کی یہ آخری تالیف ہے جو پہلی بار مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۹۶ء میں طبع ہوئی پھر ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی اور تیسری بار خاکسار نے اس پر حواشی اور طویل مقدمہ لکھ کر ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ (پاک اکیڈمی، کراچی)

اس مقدمے میں ہم سیرت فریدیہ پر ایک 'حیات' اور 'سیرت' کی حیثیت سے تفصیلی اظہار خیال کر چکے ہیں، اس وقت اختصار کے ساتھ اس کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

سرسید نے یہ کتاب اپنے نانا خواجہ فریدالدین کی سوانح کے طور پر لکھی تھی جو اکبر شاہ ثانی کے وزیر اعظم رہے تھے اور جنھیں شاہ نے دبیرالدولہ امین الملک مصلح جنگ کا خطاب دیا تھا، اور سرسید نے یہ خطاب بشمول سرورق پوری کتاب میں استعمال کیا ہے اور ۱۸۹۶ء میں کیا ہے۔

اس کتاب پر ایک 'حیات' کی حیثیت سے جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک غیر معیاری اور ناقص و نامکمل سوانح ہے، اردو میں اس سے پہلے حالی و شبلی، حیات سعدی اور المامون شائع ہو چکی تھیں ان سے اس کتاب کا موازنہ کرنے پر مایوسی ہوتی ہے اور سرسید سے منسوب کر کے تکلیف ہوتی ہے۔

صاحب سوانح کی تعلیم کا بیان نہ ہونے کے برابر ہے، ۳۵ سال کی عمر میں ریاضی کی تعلیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لئے ان کے لکھنؤ جانے کے ذکر پر سرسید نے یہ باب ختم کر دیا ہے، اس کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ اس عمر تک انھوں نے کن کن علوم کی تحصیل کی تھی؟ کن کن اساتذہ سے فیض حاصل کیا تھا؟ ریاضی کی تحصیل کیلئے دہلی کے فضلاء ریاضی کو چھوڑ کر لکھنؤ جانے کے کیا اسباب تھے؟

خواجہ کے حلقۂ احباب کی کوئی جھلک قاری کو نہیں دکھائی، حال آں کہ کسی شخص کے مقام کے تعین اور مذاق کے تعارف کے لئے اس کے حلقۂ احباب سے متعارف کرانا ضروری ہوتا ہے، وہ کس معیار کا آدمی تھا؟ کس قسم کے افراد میں اس کی آمد و رفت اور نشست و برخاست تھی؟

اولاد و احفاد کا تذکرہ بڑا ناقص ہے، خواجہ کی وفات ۱۸۲۸ء میں ہوئی تھی۔ ان کی وفات کے ۶۸ برس بعد شائع ہونے والی اس کتاب میں ان کے صرف بیٹوں کے نام ہیں حال آں کہ یہ وہ وقت ہے کہ جب خواجہ کے نواسے (سرسید) کے پوتے (راس مسعود) ہوشیار ہو گئے تھے، ظاہر ہے کہ خواجہ کے بیٹوں کے تو پوتے بھی صاحب اولاد ہوں گے مگر ان کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

خواجہ کے لئے لکھا ہے کہ وہ سات سو روپے ماہوار پر مدرسۂ کلکتہ کے سپرنٹنڈنٹ رہے تھے اولاً تو ۱۸۳۹ء میں جام جم میں سرسید نے خواجہ کو مدرسہ کا نخستین مدرس (مدرس اول) لکھا ہے (ص۲۰) اور اس کتاب میں سپرنٹنڈنٹ لکھ رہے ہیں؟ ان دونوں اقوال میں تطبیق کی ضرورت ہے، ثانیاً مدرسہ کلکتہ کی (جسے مدرسۂ عالیہ بھی کہا جاتا ہے) ایک مبسوط تاریخ مولوی عبدالستار نے لکھی ہے اس کی رو سے نہ صرف اس سن میں بلکہ کسی بھی زمانے میں مدرسے میں سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ نہیں رہا اور پھر خواجہ فریدالدین نامی کوئی بزرگ اس مدرسے کے کسی عہدے پر نظر نہیں آتے اس کے علاوہ سات سو روپے ماہانہ تنخواہ اس دور میں مدرسے میں کسی کی نہیں تھی، ویسے بھی اس دور میں ملک کی تنخواہوں کے معیار سے یہ گراں قدر مشاہرہ مطابقت نہیں رکھتا۔

© rasailojaraid.com